اُردو ادب میں طنز و مزاح کا مستقبل۔ سرسری جائزہ

ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک
ایف سی کالج یونی ورسٹی، لاہور۔ پاکستان

تاریخ شاہد ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی طرح اردو طنز و مزاح پہ بھی کئی بار پیغمبری وقت آیا اور ہر بار اس نے:

پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں

کے مصداق استقامت پکڑی۔ یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ اردو کی سرزمین پہ طنز و مزاح کا بیج آج سے ساڑھے تین سو سال قبل جنم لینے والے میر جعفر زٹلی نے کاشت کیا تھا، جو اپنی ساری ذہانت و فطانت کے باوجود یہ اندازہ نہ کر سکا کہ برِعظیم کی آمرانہ و شاطرانہ آب و ہوا ابھی اس لطیف و لذیذ پودے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلوں کے ہاں تخت کشی اور بخت رسی کا روایتی سلسلہ جاری تھا۔ ان کثیف حالات میں شاعرِ خوش گفتار کی شوخی و لن ترانی کو خودسری و سرکشی پر محمول کیا گیا اور اردو دنیا کے پہلے مزاح نگار کو راج ہٹ سے جنم لینے والی احمقانہ و سفاکانہ 'تسمہ کشی' کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

اِس طرح جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے کی پاداش میں برِعظیم میں آزاد میڈیا کے اولیں علَم بردار کا خونیں انجام ہندوستان کے ادبی ماحول کو کامل سوگوار بنا گیا۔ خدائے سخن میر تقی میر کا یہ استفسار کسی ایسے ہی قومی و علمی سانحے کی کوکھ سے پھوٹا دکھائی دیتا ہے:

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزمِ عیشِ جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

کا جعفر جو محض نام ہی کا زٹلی (جھوٹا) ثابت ہوا، اس کے محض ایک سچ کی پاداش میں اردو طنز و مزاح کا مستقبل:

شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد (غالب)

کی تصویر بنا نظر آتا ہے۔ اس آمرانہ دہشت گردی کے بعد اردو طنز و مزاح پر بڑی دور تک سناٹا ہے۔ اس آمرانہ ہیبت کا اندازہ اس امر سے کیجیے کہ اس واقعے کے پچاس سال بعد بھی انشاءاللہ خاں انشا جیسا باکمال طناز اور لاجواب ظریف ہمیں شاہی دربار میں مسخرے کے روپ میں دکھائی دیتا ہے۔ ستم یہ کہ اگلے سو سال تک بھی اردو طنز و مزاح کے حواس بحال ہوتے نظر نہیں آتے۔ اور ادب کا یہ باکمال شعبہ کئی زمانوں تک قلم کاروں کی نوک جھونک، شیخ و واعظ کی چھیڑ چھاڑ اور میلوں ٹھیلوں کی مضحکہ خیز تصویر کشی سے ایک قدم آگے بڑھنے پہ مائل دکھائی نہیں دیتا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابھی اِس کے حواس بھی پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے کہ برِعظیم کی سٹیج پہ ۱۸۵۷ء کا سماعت شکن سناٹا دیتا ہے۔ اس کے بعد تو لگتا تھا کہ ہندوستان کی زندگی سے طنز و مزاح کا جنازہ اُٹھ جائے گا، لیکن پھر اسی ادبی بانجھ پن میں اردو ادب پہ غالب کی وحی نازل ہوتی ہے، جس نے اپنی ساری ذاتی و معاشرتی خستہ حالی کے باوجود شاہدِ معنی کو اس قرینے سے ظرافت کا لحاف اوڑھایا کہ برِعظیم بے آب و گیاہ زندگی سے رنگا رنگ شگوفے پھوٹتے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ لارڈ بائرن نے کہا تھا کہ میں ہنستا اس لیے ہوں کہ کہیں رونہ پڑوں، میرزا غالب نے بھی سارا ذاتی و معاشرتی کرب اپنی شوخیِ طبع کے سپرد کر دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ ستم و الم ہمارے اوپر خارج سے وارد ہوتے ہیں لیکن ہنسی کا سرچشمہ ہمیشہ انسان کے اندر سے پھوٹتا ہے، جو اکثر اوقات خارج سے

واردومسلط ہونے والے حُزن وملال کوخس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ بلکہ غالب نے تو ثابت کر دیا کہ طنز ومزاح کا غنچہ ہمیشہ بادِ نا موافق ہی میں زیادہ استقامت وطراوت کے ساتھ کِھلتا ہے۔انھی کے بقول:

؎ رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گُل ہائے نازکا

غالبؔ کا سر اٹھانا تھا کہ پھر اسی سنگلاخ دھرتی سے ظاہر دار بیگ، خوجی، حاجی بغلول، اکبر کے ظرائف اور آبِ حیات کے لطائف پھوٹ نکلے۔ اردو ادب وصحافت میں 'اودھ پنچ' کا طوفان برپا ہوگیا۔ بلکہ پورے ہندوستان میں 'پنچ' اخباروں کی ادا پھوٹ نکلی۔انھی 'پنچ گانہ' قہقہوں کی گونج میں بیسویں صدی کا سورج طلوع ہوتا ہے۔

یہ وہی زمانہ ہے جب دنیا بھر میں آزادیِ جمہور کا نقارہ باج چکا ہے، جس سے ہمارے ہاں بھی آمریت کے اوسان خطا ہوتے دکھائی دیتے ہیں، اور اردو مزاح کے چہرے پہ بھی پہلی بار رونق کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ یہی آب وہوا رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، چراغ حسن حسرت، ابراہیم جلیس، ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک اور شفیق الرحمٰن جیسے پُر کیف مزاح نگاروں کی فصل اگانے میں کامران ٹھہرتی ہے، اوران میں ایک ایک پودا تناور درخت کا روپ دھارتا دکھائی دیتا ہے۔

ایسے میں برِعظیم کی سیاسی وسماجی زندگی میں ایک دھماکہ اور ہوتا ہے، جی ہاں ۱۹۴۷ء کا دھماکہ۔۔۔۔جب ایک خوش گوار لمحہ چند مفاد پرست طالع آزماؤں بدنیتی وبدعملی سے قیامت خیز منظر میں تبدیل ہوگیا، اور فکر تونسوی کے کے بقول پنجاب میں پانچ دریاؤں کے متوازی خون کا چھٹا دریا بہ نکلا۔ تقسیمِ ملک کے وقت برِعظیم کی سیاسی وسماجی زندگی کو جو خونی دھچکا لگا، اس نے طنز ومزاح کے سرسبز وشاداب پودے کے لیے بادِ سموم کا کام کیا۔ان حالات میں اردو ادب کی یہ ہری بھری کھیتی بری طرح جھلس کے رہ گئی۔اب ایسی آب وہوا میں خالص مزاح کی کلیاں کہاں سے چٹکتیں؟ ظرافت کے غنچے کیونکر نمو پاتے؟ شوخی وشرارت کی پھوار کہاں سے برستی؟

یہی وجہ ہے کہ اس دور میں لے دے کے کڑوی کسیلی طنز ہی کے کچھ نمونے ملتے ہیں۔ایک طرف سعادت حسن منٹو نے قلم کو کمان پر چڑھا رکھا ہے تو دوسری جانب فکر تونسوی زہر میں بجھا نشتر ہاتھ میں تھامے نظر آتے ہیں۔محمد خالد اختر کی 'بیس سو گیارہ' بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔ڈاکٹر قمر رئیس اس دور کے مزاحی ادب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دراصل تقسیم اور آزادی کے نتیجے میں ملک میں کچھ ایسے اندوہ ناک حالات پیدا ہوئے کہ ہنسی کا کال سا پڑ گیا۔ظرافت نگار ہی نہیں، اچھے بھلے افسانہ نگار اور شاعر بھی طنز میں طبع آزمائی کرنے پر مجبور ہو گئے۔طنز کبھی تلخی اور زہرناکی اور مزاح کی ہلکی ہلکی چاشنی لیے ہوئے دبے پاؤں جدید تخلیقی ادب کی شریانوں میں داخل ہونے لگا۔ملک گیر فسادات، اغوا اور عصمت ریزی کے بہیمانہ جرائم اور پھر ہجرت کے اذیت ناک واقعات کے زخم اتنے کاری تھے کہ مدتوں تک چاٹنے کے بعد بھی مندمل نہ ہوئے۔

نامی انصاری اسی صورت حال کی تصویر کشی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں جو طوفانِ بلا خیز اُٹھا، اس نے برِصغیر کے انسانوں کو ایک ایسی مشکل صورت حال سے دوچار کر دیا، جس سے ذہن ودل ماؤف ہو گئے۔ میں ایسے میں انسان کا زندہ اور محفوظ رہنا ہی ایک مشکل عمل بن گیا، طنز ومزاح کون لکھتا؟ دس پندرہ سال کا عرصہ گزرنے کے بعد جب تقسیمِ ہند کی اڑائی ہوئی گرد ذرا تھمی تو اردگرد کی چیزیں بھی کچھ صاف نظر آنے لگیں اور ادیبوں کو بھی قلم اٹھانے کا حوصلہ پیدا ہوا۔

تقسیم کے بعد بارہ چودہ برس تک اردو مزاح پہ اسی طرح ہُو کا عالم طاری رہا۔ یہ سکوت ساٹھ کی دہائی میں کے آغاز میں ٹوٹا اور ایسا ٹوٹا کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل بنتا نظر آنے لگا۔اردو مزاح کی نشاتِ ثانیہ کا آغاز ۱۹۶۱ء میں منظرِ عام پہ آنے والی مشتاق احمد یوسفی کی پہلی تصنیف 'چراغ تلے' سے ہوتا ہے۔جس نے

ڈیڑھ دہائی سے روتے بسورتے اردو مزاح کی انگلی پکڑ کے اسے ایک نئی طلسماتی اور کھلکھلاتی دنیا میں داخل کر دیا۔

مشتاق احمد یوسفی کی آمد خزاں رسیدہ اردو مزاح کے لیے ابرِ بہاراں کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر ابنِ انشا، کرنل محمد خان اور مجتبیٰ حسین وغیرہ بھی اس ویرانے میں بادِ نسیم کے جھونکوں کی صورت نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ خزاں رسیدہ چمن گل وگلزار میں تبدیل ہو گیا اور اس ویرانے میں پوری دھوم دھام سے بہار آ گئی۔

اردو مزاح میں نئے خون کی شمولیت کے بعد اس کے موضوعات کے ساتھ ساتھ اس کے فکری اور تخیلاتی آفاق بھی پھیلتے چلے گئے۔ غالب کی شستہ و شگفتہ نثر کے بعد بھی ایک عرصے تک تمسخر، ٹھٹھول اور عملی مذاق ہی سلطنتِ مزاح پر ناجائز قبضہ جمائے رہے۔ یہ بدعت اردو ادب میں 'اودھ پنچ' نے متعارف کروائی تھی، جسے ہمارے بعض بسیار نویس مزاح نگاروں نے سہارا دیے رکھا لیکن بیسویں صدی کے زمین پر قدم رکھتے ہی پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ اور انجم مانپوری جیسے داناؤں نے اسے دوبارہ تہذیب وشائستگی کی پگڈنڈی پر ڈال دیا۔

ہمارے جدید مزاح نگاروں نے غالب کی طرح اس بھید کو پا لیا کہ مزاح محض ٹھٹھے مذاق کا نام نہیں بلکہ قدم قدم پر ذہانت اور متانت کا متقاضی ہے۔ ان کے اسی حسنِ خیال وعمل نے تفنن کو تفکر اور شرارت کو بصیرت کے ہم رکاب کر دیا۔ انھوں نے یہ راز جان لیا کہ مزاح، ظاہری زندگی میں قہقہوں کی چنگاریاں بکھیرنے کے ساتھ ساتھ باطن کی آگ میں پگھل کر اسے نکھارنے اور کندن بنانے کا فریضہ بھی انجام دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس صنف یا اسلوب میں فنی پختگی اور عملی ریاضت کے ایسے ایسے نمونے فراہم کیے اور طنز ومزاح کے اس سلسلے کو ایسا وقار اور اعتبار بخشا کہ اسے دوسرے درجے کا ادب قرار دینے والوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

اس شعور وادراک کے طنز ومزاح کے ساتھ ساتھ ہمارے مجموعی ادب پر بھی نہایت مثبت اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ خاص طور پر ہماری اردو نثر کو جو فروغ حاصل ہوا اس میں ایک معتد بہ حصہ ہمارے مزاح نگاروں کا ہے۔ جنھوں نے ایسی دلبری سے اردو زبان کے ناز اٹھائے ہیں کہ اور گیسوئے اردو کو ایسی دلربائی اور فنکاری کے ساتھ سنوارا ہے کہ آج بلاشبہ اردو نثر کے سلسلۂ ہمالیہ پر مزاح نگاری کا جھنڈا لہراتا نظر آتا ہے۔ غالبؔ کی وفات کے ایک سو سال بعد ہی یہ ٹوٹا ہوا تارامہِ کامل بن گیا۔ اور دنیا بھر میں تخلیق ہونے والے طنز ومزاح کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے قابل ہو گیا۔

آج یہ بات نہایت افسوس کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ گذشتہ رُبع صدی سے سرحد کے دونوں جانب اردو طنز ومزاح کی صورت حال رُو بہ زوال ہے۔ جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اردو ادب کے اس شعبے کو بامِ ثریا کا راستہ دکھانے والا ادیبوں کا قافلہ منظر سے تقریباً اوجھل ہو چکا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی، عنایت علی خاں، انور مسعود، عطاء الحق قاسمی، مجتبیٰ حسین اور بعض دیگر بزرگان کا دم ہمارے لیے غنیمت ہے۔ ان میں سے بیشتر منقار زیر پر ہیں۔ بعض احباب صرف مشاعروں میں چہکتے ہیں۔ یوسفی صاحب نے بیس سال قبل 'آبِ گُم' کا دھماکہ کیا تھا، اس کے بعد سے وہ آج تک سوچوں اور 'جیو' میں گُم ہیں۔ ان کی نئی 'پال' کھلنے کے انتظار میں ان کے محبان کی آنکھیں پتھرا چکی ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کالم کی صنف کے امام ہیں۔ اور انھوں نے گذشتہ ایک دو سالوں میں 'غیر ملکی سیاح کا سفر نامۂ لاہور' اور 'تعزیت نامے' کے ذریعے فرضِ کفایہ ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، لیکن صاحبو! شبنم سے پیاس اور رِم جھم سے آگ کہاں بجھتی ہے؟

جہاں تک مزاح نگاروں کی نئی کھیپ کا تعلق ہے، خدا لگتی کہوں تو ان میں بعض کی صورتِ حال تو شاعر کے اس مصرعے کی سی تھی:

اُڑنے سے پیشتر ہی میرا رنگ زرد تھا

ان میں بعض کا آغاز چونکا دینے والا تھا، انھیں قدرت کی طرف سے ظرافت کا بے پناہ ملکہ عطا ہوا تھا، لیکن وہ کمر شلزم کی دوڑ میں اتنا تیز بھاگے کہ جلد ہی ان کا سانس پھولنے لگا۔ انھوں نے اپنی سانسیں اور توانائیاں بحال کرنے کے لیے احباب واصحاب کا خون چوسنا شروع کر دیا۔ اس طرح ادب میں مزاح نگاروں کی جگہ جونکوں کا اضافہ ہوتا چلا گیا۔

پھر اس سلسلے میں ہمیں الیکٹرنک میڈیا سے بھی بہت سی امیدیں تھیں، کیوں کہ لمحۂ موجودہ میں قوم کی تربیت وتفریح کے ان کی طرف سے بھی بہت

دعاوی دیکھنے میں آ چکے تھے۔آپ جانتے ہیں کہ گذشتہ چند برسوں میں ہمارے اردگرد ٹی وی چینلز برساتی کھُمبیوں کی صورت اُگ آئے ہیں۔ان میں ہر ٹی وی چینل کے ایک ہاتھ میں معلومات اور دوسرے میں تفریح کے دعوے کا پھریرا تھا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بیشتر ٹی وی چینلز ابھی تک عوام کو موبائل فونوں کے اشتہارات اور سیاست دانوں کے انٹرویوز سے زیادہ تفریح فراہم نہیں کر پائے۔ان سب میں 'جیو ٹی وی' پھر بھی قابلِ مبارک باد ہے کہ جس نے 'بہ زبانِ یوسفی' اور 'توں کیہ جانیں' جیسے پروگرام پیش کر کے ادب اور ادیبوں کو شجرِ ممنوعہ کے لیبل سے بچالیا۔

آپ یقیناً میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ آیندہ زمانوں میں اردو طنز و مزاح کے لیے ان سب سے بڑا خطرہ اردو زبان کا مخدوش حال اور مشکوک مستقبل ہے۔اردو زبان کے بارے یہ غیر یقینی اور تشویش ناک صورتِ حال برِّعظیم کے دونوں ممالک میں پائی جاتی ہے۔ایک طرف واشگاف انداز میں اور دوسری جانب منافقانہ طریقِ کار کے ساتھ۔اور ہمارا خیال ہے کہ دوسری قسم کی صورتِ حال پہلی سے بھی زیادہ کطرناک ہے کہ ایسے میں احتجاج اور انصاف طلبی کی طرف بھی دھیان کم ہی منتقل ہونے پاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے جتنا شور بھارت کے ادیبوں کی طرف سے اٹھا ہے، پاکستان میں اس کا عُشرِ عشیر بھی نظر نہیں آتا۔ڈاکٹر رؤف پاریکھ لکھتے ہیں:

''اردو کا درد بھارت کے مزاح نگاروں میں بطورِ خاص محسوس ہوتا ہے۔کنہیالال کپور، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم نے بھارت میں اردو کی حالتِ زار پر بڑے دکھ سے اور احساسِ بے بسی کے ساتھ طنز کیے ہیں۔''

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان بنانے کے اہم ترین مقاصد میں ایک بڑا مقصد اردو زبان کا تحفظ اور فروغ بھی تھا۔تنگ نظر ہندوؤں کو اس کے عربی، فارسی رسم الخط کی وجہ سے اس میں اسلام کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔یہی بات ہمارے لیے باعثِ فخر و اطمینان ہونا چاہیے تھی۔ہم اس زززززبان کو کم از کم اتنی اپنائیت اور اعتماد تو بخش دیتے کہ ہندی اور انگریزی جیسی پرائی زبانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے قابل ہو جاتی۔ہمیں یقین ہے کہ اردو ترویج و ترقی کے اٹھایا جانے والا ہر قدم ہمارے ظاہری اور چھپے دشمنوں کی چھاتی پر پڑتا۔ہم حُبِّ حسینؓ میں نہ سہی بُغضِ معاویہؓ ہی میں یہ کام کر گزرتے، لیکن افسوس ایسا نہ ہو سکا۔

زبان کی یہ غیر یقینی صورتِ حال اردو ادب اور بالخصوص اردو مزاح پر بری طرح اثر انداز ہونا شروع ہو چکی ہے۔اور اس پر تھکن کے آثار نمایاں ہونا شروع ہو چکے ہیں، جس کا فوری تدارک از حد ضروری ہے، کیوں کہ زمین کے جس خِطّے میں بھی ہمیں انسانیت کا ترفُّع مقصود ہے، وہاں اچھے اور معیاری مزاح کی ہر لمحہ ضرورت ہے۔یہ حقیقت ہے کہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے ایک مسکراہٹ یا قہقہہ ایٹم سے بھی زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ایٹم کی اثر پذیری زمانی اور زمینی حوالے سے محدود ہے جب کہ مسکراہٹ اور قہقہے کی حدیں کائنات اور تاریخ جتنی وسیع ہیں۔مسکراہٹ تو وہ زبان ہے، جو دنیا کے ہر کونے میں ہر رنگ و نسل اور عمر کا ہر فرد نہ صرف سمجھتا ہے، بلکہ ہر دم اس کا طلب گار بھی رہتا ہے۔یہ مسکراہٹ اور قہقہہ ظاہر ہے مزاح کی دین ہے۔

وقت جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے، زندگی مشینی ہوتی جاتی ہے۔پھر ساتھ ساتھ یہ المیہ بھی درپیش ہے کہ دنیا کی آبادی میں جس قدر اضافہ ہوتا جاتا ہے، انسان اسی قدر تنہا ہوتا جاتا ہے۔ایسے میں انسان کے احساسِ مروّت کو کچلے جانے سے بچانے کے لیے جہاں ادب کے مجموعی فروغ کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے، وہاں ایسے میں طنز و مزاح تو آبِ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ان حالات میں اصحابِ قلم کے ساتھ ساتھ اربابِ حل و عقد اور اصحابِ فکر و دانش کی جانب سے تدبّر اور تدبیر کی بڑی اشد ضرورت ہے۔

☆☆☆